۲ کتبہ

یہ سبق پڑھنے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ:

- نظم/نثر کو فہم کے ساتھ پڑھ کر متعلقہ سوالات (براہ راست، بالواسطہ، کثیر الجہت) کے جوابات دے سکیں۔
- منثور/منظوم کلام سے متعلق اشارات اور اہم نکات سن کر ان کی فہم کا تجزیہ کر سکیں۔
- مباحثوں، مذاکروں میں موضوع کے حق یا مخالفت میں حصہ لے سکیں۔
- مختلف منظوم/منثور اصنافِ ادب پڑھ کر مصنفین کے طرزِ تحریر کی شناخت کر سکیں۔
- کہانی/مضمون/افسانے/ڈرامے کو پڑھ کر اس کے اجزا (پیرا گراف، اس کے کرداروں کا تعارف، ابتدا، مناظر کا بیان، اختتام) کو شناخت کر سکیں۔
- کسی بھی نظم یا نثر کو پڑھ کر اس کے اہم نکات کا خلاصہ لکھ سکیں۔
- کسی بھی نظم/نثر کو پڑھ کر قاری کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے مرکزی خیال تحریر کر سکیں۔
- پڑھے گئے متن کے کسی حصے کو دہراتے ہوئے حوالوں اور دلائل کے ساتھ اظہارِ رائے کر سکیں۔
- مختلف حروف (ندا، تاسف، تشبیہ، تحسین، انبساط، نفرین) کی نشان دہی کر سکیں۔

پڑھیں

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دِن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اِس علاقے تک جاتی ہے ایک ایسے دریا کا رُوپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خَس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جُوتوں کے اندر تلوے جُھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا بُخارات اُٹھ رہے تھے۔ شریف حسین کلرک درجہ دوم، معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اُس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔

گھر لَوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لُطف تھا جو اُسے مہینے کے شروع کے چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دِن انھی مبارک دِنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد اُس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دِن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پُوریاں لے کر

National Book Foundation

کھالی تھیں اور اُوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی۔ اِس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں اور ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈِسپیچر، اکاؤنٹینٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ، غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجے اور حیثیت کے کلرک تھے۔ اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کے نیکر، اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابُو، چھاتہ کھولے، مُنھ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے۔ ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اِس اُمید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گُتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سُلجھا سکے۔ ممکن ہے گھر کی یک سُوئی میں ان کا کوئی حل سُوجھ جائے۔ مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کے کاموں میں ایسے اُلجھ جاتے کہ انھیں دیکھنے تک کا موقع نہ مِلتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جُوں کا تُوں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا، جِسے بٹن ٹُوٹ جانے پر انھوں نے سیفٹی پِن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تَر بہ تر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے، سلے سِلائے، ڈھیلے ڈھالے بد قطع سُوٹ پہنے، اس گرمی کے عالَم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔

گو اِن میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اِس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر آسکتی ہے بلکہ یہ کہ انھیں دفتر میں دِن بھر اپنے افسروں سے اِسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

اِن کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے اور ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ، جہاں دِیدہ گھاگ بھی، جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اُتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس، تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گُدی میں ذرا نیچے خَم سا آگیا تھا اور کند اُستروں سے متواتر داڑھی مونڈتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں میں جڑیں پُھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پیدل چلنے والوں میں بُہتیرے لوگ بخُوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کتنے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چِڑچِڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حُسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ شریف حسین نے اِکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کی بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا۔ جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں مِلتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں آور لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بہ جائے خود ایک پُر لُطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹو گرافروں کے

National Book Foundation

جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا، سَیر دیکھتا اس طرف جانکلا جہاں کباڑیوں کی دُکانیں تھیں۔

یہاں اُسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بِلا شبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اِس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹُوٹ پُھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گُل دان، ٹیبل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہوئی بیٹریاں، چوکھٹے، گراموفون کے کَل پُرزے، جراحی کے آلات، ستار، بُھس بھرا ہرن،، پیتل کے لم ڈِھینگ، بُدھ کا نیم قد مجسمہ۔۔۔۔

ایک دکان پر اس کی نظر سنگِ مَرمَر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اُکھاڑا گیا ہے۔۔اس کا طُول کوئی سَوا فٹ تھا اور عَرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی، اس کے کیا دام بتائے گا، قیمت دریافت کی۔

"تین روپے!" کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے۔ مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دِیا اور چلنے لگا۔

"کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتایے کیا دیجیے گا!"

وہ رک گیا۔ اُسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا دام اِس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے گا کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکان داروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔" یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔ "اجی سنیے تو، کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سَوا روپیہ بھی نہیں۔۔۔اچھا لے جایئے۔"

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ مَیں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لَوٹنے کے سِوا کوئی چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نَقص نظر آئے تو اس سودے کو منسُوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا کیوں بیچنا قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصّرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دِن پِھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے۔۔۔۔ یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔ مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمرِیں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بُھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہُوا تھا تو اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعیِ لا حاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چلا تھا مگر سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہَل چَل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق

National Book Foundation

طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر، یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہُوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا۔ جس نے بہت چابک دستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خُوش نما بیلیں بنا دِیں۔ سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کُھدا دیکھ کر اُسے ایک عجیب سے خُوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جَلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہُوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اُتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ کر دِیا تھا۔ اور اس پر ایک نظر اَور ڈال لے مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کے ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبے کو دیکھ کر اس کے اُن خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دِنوں سے اس کے دماغ پر مُسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دل کش تحریر پر گاڑے دِھیرے دِھیرے سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قُفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہُوا کہ اس کے مکان کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جاسکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر پڑے۔

قُفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبہ کو کہاں رکھوں۔ اس کے ایک حصہ مکان میں دو کوٹھریاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھری میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اس بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبہ ہی پر پڑتی۔ اُمیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہ نمائی کا جُویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا۔ آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہِ لُطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کی بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آجاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا، مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی مِلا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دُھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بہ خوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبہ کو گرا نہ دے اسے وہاں سے اُٹھالیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دِیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اسی صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو اس صندوق سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چناں چہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بے کار صابن

دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفۂ غیبی سے نصیب ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اُٹھانی پڑتی۔ پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری اور پرانی کار گزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا، صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر لِکا دِیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا کیوں کہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کار گزاری دکھانے کے لیے چُھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دُگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خُوش رکھنے کے لیے بہت سا اُن کا کام بھی کر دیتا گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خُوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دِل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے ۔۔۔۔ ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے ۔۔۔۔ ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے۔

مگر جب تین مہینے گزرے تو نہ اس کلرک نے چھٹی کی معیاد بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا۔ اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سُستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بے زار بے زار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہِ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اسکول کا کام کیا کرتا۔ چوں کہ میز کے ہِلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی۔ اس لیے اس لڑکے نے اسے اُٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دِیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر، کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اُٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دِیا جس میں روزمرہ استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔

شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پِیلا پڑ چلا تھا۔ اُٹھا کر دھویا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند

ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کو کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہُوا بد نُما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھری دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گُدی سے ذرا نیچے خَم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوش حالی اور فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو۔ تصورات کو اُڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم، اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات، پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش۔۔۔ یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب ملا کر کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہ وار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں باخوبی گزر ہونے لگی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔ اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بادولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کم زوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اُٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تُند ہوا تیر کی طرح اس کی سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو، دِن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہُوا۔ وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے یہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالَم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبہ کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

(آتندی)

غلام عباس(۱۹۰۹ء۔۱۹۸۲ء)

غلام عباس اُردو کے نام ور افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ امر تسر کے ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم لاہور سے حاصل کرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر سے لکھنے کا آغاز کیا۔ بچوں کے لیے کتب لکھنے کے ساتھ ساتھ رسائل میں بہ طور معاون مدیر اپنے فرائض انجام دیے۔ محکمہ تعلقاتِ عامہ اور ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے۔ آپ ترکی ادب سے گہرا لگاو رکھتے تھے۔ آپ کی باوقار اور کام یاب تخلیقی زندگی اور ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے حکومتِ پاکستان نے ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا۔

پریم چند کے بعد آپ کو افسانہ نگاری میں عروج اور شہرت حاصل ہے۔ ''کتبہ'' آپ کا شاہ کار ہے۔ آپ نے اپنے افسانوں میں حقیقت کی ترجمانی کی ہے آپ نے نہایت کمال سے عام افراد اور ان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ وہ عام سے موضوع پر اس خوب صورتی سے قلم اٹھاتے ہیں کہ تمام سماج ان کے افسانے کا کردار اور موضوع محسوس ہوتا ہے، آپ نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا مغربی تعلیم اور تہذیب اپنا رنگ جما رہی تھی اور لوگ کش مکش کا شکار تھے کہ مشرقی روایات کو تھامے رکھیں یا نئی تہذیب کا دامن تھام لیں آپ نے اس کیفیت کو خوب صورت سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

آپ کا اسلوب بیان نہایت سادہ اور پُر اثر ہے۔ آپ افسانوں میں نفسیاتی تجزیہ موجود ہے۔ زبان کی صحت وصفائی کا افسانوں میں التزام ہے۔ آپ کے اسلوب نے معمولی موضوعات کو غیر معمولی بنا دیا۔ آپ کا قلم جذبات کے بہہ جائے تعقل پسندی کا قائل رہا۔ آپ نے زندگی کے تلخ حقائق کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے آپ کے کردار ہماری زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں ''آنندی'' جاڑے چاندنی کی، کن رس، دھنک اور گوندنی والا تکیہ زیادہ مشہور ہیں۔

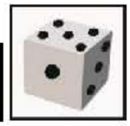

مشق

ا۔ مندرجہ ذیل میں سے درست جواب کے گرد دائرہ لگائیے۔

i۔ غلام عباس کا تعلق کس صدی سے ہے؟

الف۔ اٹھارویں　　ب۔ انیسویں　　ج۔ بیسویں　　د۔ اکیسویں

ii۔ غلام عباس کس ادب سے زیادہ متاثر تھے؟

الف۔ انگریزی　　ب۔ عربی　　ج۔ فارسی　　د۔ ترُکی

iii۔ قواعد کے اعتبار سے ''کہ'' کون سا حرف ہے؟

الف۔ شرط　　ب۔ جاد　　ج۔ بیان　　د۔ تمنا

iv۔ ایسے حروف کو کیا کہیں گے جو ایک اسم کا تعلق دوسرے اسم سے ظاہر کریں؟

الف۔ حروف استفہام　　ب۔ حروف اضافت　　ج۔ حروف عطف　　د۔ حروف بیان

v۔ صنفِ نثر مضمون کتنے حصّوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

الف۔ ایک　　ب۔ دو　　ج۔ تین　　د۔ چار

vi۔ غلام عباس کے اسلوب کی نمایاں خوبی کیا ہے؟

الف۔ جانب داری　　ب۔ حقیقت پسندی　　ج۔ معاشی کش مکش　　د۔ جذبات نگاری

National Book Foundation

۲۔ درج ذیل نثر پارے کو فہم کے ساتھ پڑھ کر دیے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

''پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب ملا کر کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہ وار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں باخوبی گزر ہونے لگی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔ اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بادولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کم زوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔ جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اُٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تُند ہوا تیر کی طرح اس کی سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو، دِن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہُوا۔ وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔''

الف۔ شریف حسین کو کتنے برس کی عمر میں پینشن مل گئی؟

ب۔ پینشن ملنے کے وقت شریف حسین کے تینوں بیٹے کیا کر رہے تھے؟

ج۔ شریف حسین کوئی کاروبار شروع کیوں نہ کر سکا؟

د۔ آخری عمر میں شریف حسین کے چارپائی پر پڑے رہنے کا سبب کیا تھا؟

ز۔ شریف حسین کو نمونیہ کیوں ہوا؟

ہ۔ ''اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں'' اس جملے کا مفہوم لکھیں؟

ی۔ کتنے دن بیمار رہنے کے بعد شریف حسین مر گیا؟

۳۔ افسانہ

لغت میں افسانہ ایک جھوٹی کہانی کو کہتے ہیں ادبی اصطلاح میں یہ ایک ایسی کہانی ہے جو زندگی کا ایک جُز و پیش کرتی ہے۔ افسانہ اختصار اور وحدت تاثر کی حامل ایک کہانی ہوتی ہے۔ افسانہ یا مختصر افسانہ کم سے کم آدھے گھنٹے میں پڑھا جانے والا ایسا قصہ ہوتا ہے جس میں کسی ایک واقعہ یا زندگی کے کسی ایک پہلو کو اختصار اور دلچسپی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

افسانہ کے اجزائے ترکیبی: پلاٹ، کردار، نقطہ نظر یا مرکزی خیال، مکالمہ، آغاز و اختتام، اسلوب بیان

۴۔ طلبہ سے ''کتبہ'' کے درج ذیل اہم نکات اور اشارات کی بلند خوانی کرائی جائے۔ ان نکات اور اشارات کو سن کر ہر طالب علم جزئیات نگاری اور موضوع کا اپنے اپنے طور پر تجزیہ پیش کرے۔

سرکاری عمارتیں

دفتر سے چھٹی

مختلف کلرکوں کے حُلیے

شریف حسین کا گھر کے بہ جائے جامع مسجد جانا

National Book Foundation

کباڑی کی دکان سے کتبہ خریدنا

کتبے سے متعلق مستقبل کی خیالی تصاویر بنانا

سینئر کلرک کی جگہ تعیناتی اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا

کتبے کی جگہوں کی تبدیلی

بچوں کی ملازمت، شادی اور دیگر خانگی ذمہ داریاں

خواہشات کی تکمیل نہ کر سکنا

موت کا شکار ہونا اور کتبے کا قبر پر نصب ہونا

۵۔افسانہ ''کتبہ'' آپ نے پڑھا۔ استاد محترم کی راہ نمائی سے غلام عباس کے اسلوب تحریر پر مختصر انداز میں روشنی ڈالیے۔

۶۔''کتبہ'' افسانے کے درج ذیل اقتباس کو پڑھ کر اس کے اجزا (ابتدا، مناظر کا بیان اور اختتام) کو شناخت کریں۔

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دِن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اِس علاقے تک جاتی ہے ایک ایسے دریا کا رُوپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خَس و خاشاک بہا لایا ہو۔ گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جُوتوں کے اندر تلوے جُھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا بُخارات اُٹھ رہے تھے۔

۷۔اہم نکات کو مد نظر رکھتے ہوئے افسانہ کتبہ کا خلاصہ تحریر کریں۔

۸۔افسانہ کتبہ کا مرکزی خیال لکھیں۔

۹۔شیخ جمن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمے داری کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا، میں اس وقت انصاف کی اونچی مسند پر بیٹھا ہوں۔ میری آواز اس وقت حکم خدا ہے اور خدا کے حکم میں میری نیت کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیے، حق اور راستی سے جو بھر ٹلنا بھی مجھے دنیا اور دین ہی میں سیاہ بنا دے گا۔

پنچایت شروع ہوئی، فریقین نے اپنے حالات بیان کیے، جرح ہوئی، شہادتیں گزریں۔ فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی، جمن نے بہت غور سے سنا اور تب فیصلہ سنایا۔ ''الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ، پنچوں نے تمھارے معاملے پر غور کیا ہے سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا واجب ہے، جس وقت بیل ان کے گھر آیا، اس کو کوئی بیماری نہ تھی اگر قیمت اسی وقت دے دی گئی ہوتی تو آج سمجھو اسے واپس لینے کا ہرگز تقاضا نہ کرتے۔

رام دھن مصر نے کہا: ''قیمت کے علاوہ ان سے تاوان بھی لیا جائے، سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کر مار ڈالا۔''

جمن نے کہا: ''اس کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔''

گوڈر شاہ نے کہا سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہیے۔ ان کا بہت نقصان ہوا ہے اور اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔

❖ **مندرجہ بالا اقتباس پریم چند کے افسانے ''پنچایت'' سے منتخب کیا گیا ہے۔ شیخ جمن کا کردار آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے کا اظہار کریں۔**

National Book Foundation

۱۰۔افسانہ ''پنچایت'' کے درج بالا متن کے حصے کو طلبہ باری باری دہرائیں نیز حوالوں اور دلائل کے ساتھ اظہار رائے کریں۔اس سلسلے میں استاد محترم سے رہ نمائی بھی حاصل کریں۔

۱۱۔حروف کی اقسام

حروفِ ندا:

کسی کو پکارنے یا آواز دینے کے لیے استعمال ہونے والے حروف کو حروفِ ندا کہتے ہیں۔

مثلاً: یااللہ !اے،اے،اجی،او،ابے وغیرہ بھی حروفِ ندا ہیں۔

حروفِ تاسف:

یہ حروف غم یا افسوس کے اظہار کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں،افسوس،حیف،وائے،ہائے،اُف،ہے ہے حروف،تاسف ہیں۔

حروف تشبیہ:

یہ حروف ایک شے کو دوسری شے کی طرح بتانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

مانند، مثل، طرح، سا، جیسا، بعینہٖ، حرف تشبیہ ہیں۔

حروفِ تحسین یا انبساط:

کسی کی تعریف یا خوشی کے اظہار کے لیے بولے جانے والے حروف کو حروفِ تحسین یا حروفِ انبساط کہتے ہیں۔مثلاً:

سبحان اللہ، شاباش، بہت خوب، واہ واہ، مرحبا، وغیرہ

حروفِ نفرین:

نفرت یا ملامت کے اظہار کے لیے استعمال ہونے والے حروف مثلاً: تُف، لعنت، پھٹکار، ہزار لعنت، اخ تھو وغیرہ

۱۲۔مندرجہ ذیل دیے گئے حروف کی نشان دہی کریں۔

تف،اخ تھو،بہت خوب،مرحبا،حیف،،جیسا،مثل،اے،ابے،کا،کی،اگر،جب تک

سرگرمی

۱۔افسانہ ''کتبہ'' کو ڈرامے اور اس کے فنی لوازم کو سامنے رکھتے ہوئے جماعت کے کمرے میں جوڑیوں میں ڈرامائی انداز میں پیش کریں۔

۲۔سکول میں ''بزرگوں کا احترام'' کے عنوان سے ایک مباحثہ یا مذاکرہ منعقد کرائیں جس میں خود بھی موضوع کے حق میں حصّہ لیں۔

ہدایات برائے اساتذہ کرام

- سبق خوانی سے قبل اردو افسانہ نگاری کی روایت کی روشنی میں غلام عباس کے افسانوں اوور کوٹ، کن رس، فینسی ہیئر کٹنگ سیلون اور بہروپیا کے حوالے سے ان کے فکر و فن پر گفت گو کریں تاکہ طلبہ خود بھی غلام عباس کے طرز تحریر شناخت کرتے ہوئے اس کے متعلق تحریر کر سکیں۔

National Book Foundation